اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارہ۳، مسلسل شمارہ:۳۷۳، سال ۲۰۲۴ء

خانگی طرزِ حیات میں اظہار کے فقدان کے مسائل اور عفرا بخاری کا افسانہ

ظہیر عباس، پی ایچ ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
ادارہ زبان وادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور

THE PROBLEMS OF LACK OF EXPRESSION IN DOMESTIC BEHAVIOUR AND THE SHORT STORIES OF AFRA BUKHARI

Zaheer Abbas, PhD
Assistant Professor of Urdu
IULL, Punjab University, Lahore

Abstract

Childhood is one of the most important stages of human life. The way a child is treated at home affects his mood throughout his life.Children will find moral books and books like creative literature in every society, but how adults should treat them is a fundamental question.In developing countries like ours, no special attention is paid to the problem at the family and society level, which is the reason why the child remains suffering from various psychological complications and confusions throughout his life.An artist points to these issues in his works. Afra Bukhari is one of such fiction writers. Most of his stories are children while they are young. These children are accompanied by their relatives as well as their children. The behavior of real parents is also neglectful.This is the reason why this character in every other story of his seems to be suffering from a bottomless loneliness which has no solution. None of the adults realize this. In this article we have tried to understand this gap.Apart from this, the consequences of the gap created between children and their parents due to the lack of this dialogue are discussed. What children endure in the early years is also faced by adults and parents. have to do it.This article tries to discuss these psychological and social issues with the help of these stories.

Keywords:
Afra Bukhari, Communication Gap, Dr Muhammad Ajmal, Muhammad Hassan Askri, Psychological Issues

کسی بھی معاشرے کی تعمیر میں بچوں کا کردار بنیادی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی زینے کی مانند آگے بڑھتی ہے۔ مستقبل کے تعین میں اس کے ابتدائی برس بنیادی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جو معاشرے بچوں کو ان کے بچپنے کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں یا کم توجہ کے قابل سمجھتے ہیں مسائل وہیں جنم لیتے ہیں۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ بچے کے مسائل خود بچے نہیں بلکہ ان کے بڑے حل کرتے ہیں۔ یا ان کے مستقبل کے فیصلے بھی عام طور پر بڑے ہی کرتے ہیں۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک میں یہ مسائل اور بھی زیادہ ہیں۔ ہمارے جیسے ممالک میں بچوں کو ایک انسانی درجے سے زیادہ ایک دوسری نوع سمجھ کر سلوک کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انسان اپنی عمر کے اس درجے پر بھی مکمل فہم و شعور رکھتا ہے اور اپنا رد عمل دیتا ہے۔ نظر انداز کیا جانے والا بچہ بعد کے زمانے میں اعتماد کے فقدان کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر کی چار دیواری میں بچے سے کیا گیا سلوک گھر سے باہر اس کی شخصیت کا تعین کرتا ہے۔ نفسیاتی الجھاو یا مسائل سے قطع نظر ایسا بچہ سماجی دباو بھی برداشت نہیں کر پاتا اور یوں اس کی شخصیت میں اک مستقل ٹیڑھ باقی رہ جاتی ہے۔ بڑوں کا بچوں سے برتاو منطق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ بچے کے سوال اور بات کو عام طور پر معصومانہ یا قبل از وقت کیا گیا سوال سمجھ پر رد کر دیا جاتا ہے۔ "بچہ خواب سناتا ہے آپ بے اعتنائی سے اس کے خواب کو ٹال دیتے ہیں۔۔۔۔ بچہ رات کے اندھیرے سے ڈرتا ہے، آپ منطق کے ذریعے اس کا ڈر دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچہ اپنے حریف یا یعنی دوسرے بچہ کے وجود سے جلتا ہے۔ آپ اس فطری حسد کو سمجھنے کی بجائے اس کی فطری خباثت پر محمول کرتے ہیں۔ بچہ جھوٹ بولتا ہے۔ آپ اس کے واہمہ کی پرواز کی نوعیت کو نہیں سمجھتے۔ آپ اسے برا کہہ کر زدو کوب کرتے ہیں۔"(۱) غرض یہ کہ آپ بچے کے ساتھ برتاو کچھ یوں کرتے ہیں جیسے وہ کوئی بڑا ہو اور اپنے تمام اعمال کا منطقی طور پر ذمہ دار ہو۔ حالانکہ اسے اکثر اپنے اعمال کا ادراک بھی نہیں ہوتا۔ بجائے اس کے کہ اس کی عمر کے مطابق اس کے نفسیاتی مسائل کو سمجھا جائے اس کی شخصیت کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔ یہی خلا بوڑھے والدین اور اولاد کے درمیان بھی باقی رہتا ہے۔ بڑھاپے میں پہنچے ہووں کے معاملات کو، ان کی نفسیات کو ان کے بچے نہیں سمجھ پاتے۔ یہ خلیج ہر کلچر میں، ہر خاندان میں نظر آتی ہے۔

تخلیقی ادب میں جہاں انسانی زندگی کے مختلف پہلووں کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں ان موضوعات بحث بنایا گیا ہے۔ ان کی بلوغت سے لے کر لڑکپن کی عمر تک جن جن مسائل اور مصائب کا سامنا خاندانی اور

سماجی سطح پر انہیں کرنا پڑا ان پر مختلف تخلیق کاروں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ ایسے ناولوں اور افسانوں کی کمی نہیں ہے جن میں اس عمر کے کرداروں کی حیثیت ہی مرکزی رہی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں منٹو کی کہانی "دھواں" اور غلام عباس کی "ہمسائے" ان دونوں کہانیوں میں بلوغت کی دنیا میں داخل ہوتے بچوں کی کتھا ہے۔ ان کہانیوں میں بچوں کا سروکار یا تو خود اپنی ذات کے ساتھ یا خود بچے کا دوسرے بچے سے اپنے رشتے کو سمجھنے سے ہے۔ بڑوں کے ساتھ براہ راست ان کا معاملہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہمارے ہاں بے شمار ایسی کہانیاں بھی لکھیں گئیں جن میں بچوں کا سروکار براہ راست بڑوں سے ہے۔ عمر کی تفاوت ذہنوں میں فاصلوں کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے کی مضبوط روایت موجود ہے۔ اردو میں تراجم کی صورت میں بھی ہزاروں کی تعداد میں کتب شائع ہوتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کے بچوں کی ذہنی نشوونما اور بالیدگی کے لیے ایسی کتب کا ہونا بہت ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بچوں کی کسی بھی گھرانے میں موجودگی اور ان کی بڑھتی عمر کے ساتھ جسمانی و ذہنی تبدیلیوں کا تخلیقی ادب میں احاطہ کیا گیا؟ ہر فکشن نگار کے ہاں جزوی طور تو ایسے کردار ہمیں نظر آتے ہیں لیکن کلیت میں ان مسائل پر کم کم ہی لکھا گیا۔

ہمارے ہاں عفرا بخاری کے ہاں ایسی کہانیاں مل جاتی ہیں جن میں چار دیواری کے اندر برپا ہونے والے بچوں کے مسائل، بوڑھے والدین کی ذہنی حالتوں اور ان کی محرومیوں پر کھل کر لکھا گیا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے "فاصلے" میں زیادہ کہانیوں کا موضوع ہی لڑکپن کی حدود میں داخل ہونے والے بچوں کے نفسیاتی اور وجودی مسائل ہیں۔ عفرا بخاری کی افسانوں دنیا میں مرد کرداروں سے زیادہ نسوانی اور بچوں کے کردار زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔ ان کی دنیا چار دیواری سے باہر کم کم ہی وجود رکھتی ہے۔ ان کے بیٹے عامر فراز کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ ہم نے بچپن میں "بچوں کے لیے لکھی گئی جنوں بھوتوں، پریوں یا شہزادے شہزادیوں کی روایتی کہانیوں میں سے شاید ہی کوئی کہانی کبھی انھوں نے ہمیں سنائی ہو۔ وہ ہمارے لیے ہر روز ارد گرد کی زندگی سے ایک نئی کہانی بنتی تھیں۔"(۲) عفرا کے افسانوں میں بھی ایسی ہی صورت ہے وہ بالکل سامنے کے موضوعات پر کہانیاں لکھتی ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ ان کا نقطہ نظر بالکل معروضی رہتا ہے۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو کہانی سناتے نہیں بلکہ دکھاتے ہیں۔

اولاد نرینہ ہمارا سماجی مسئلہ ہے۔ اگر کسی کے گھر بیٹی پیدا ہو جائے تو بجائے خوشی کا اظہار کرنے کے، مبارکباد دینے والے جاتے جاتے یہ دلاسا بھی دے جاتے ہیں کہ خیر ہے اللہ بیٹا بھی دے گا۔ ایک بیٹے کی

خواہش میں دس دس بیٹیوں کا جنم دے دیا جاتا ہے۔ایسی عورت کو معاشرہ اور خود اس کا شوہر تک قبول نہیں کرتے جس کے بطن سے بیٹی پیدا ہوتی ہے۔"دل کے ویرانے "چار جوان ہوتی ہوئی سگی بہنوں کی کہانی ہے۔بیان کنندہ کے مطابق جب ان کی چوتھی بہن پیدا ہوئی تو اماں ابا کے لیے اسے قبولنا مشکل ہو گیا تو ان کی بے اولاد تائی نے اسے گود لے لیا۔ہمارے یہ ریت عام ہے کہ بے اولاد بہن بھائی کو اپنا شیر خوار اخلا قا سونپ دیتے ہیں۔ایسا بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اور اس پر ساری صورت حال منکشف ہوتی ہے تو اکلاپے کا شکار ہو جاتا ہے۔اسے ساری عمر یہ ہی سمجھ نہیں آتی کہ وہ بچہ کس کا ہے۔ایسے بچوں کو بچے عام طور پر دروں بینی میں مبتلا رہتے ہیں۔عام طور پر پرائے گھر میں رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی بہت اچھا سلوک بھی روا نہیں رکھا جاتا۔اس کہانی میں عالیہ نامی بچی کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے اس کے لیے زیادہ مسائل ہوتے ہیں۔اس کی سگی بہنیں اپنے ماں باپ کے ساتھ ہیں لیکن وہ تایا تائی کے ساتھ ہے۔جب اس کی بہنوں پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ وہ ان کی چوتھی بہن ہے اور لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کے ماں باپ نے اسے تایا تائی کو سونپ دیا تھا تو وہ اس کے ساتھ بالکل ہی نفرت انگیز رویہ اپنا لیتی ہیں۔اس رویے کی سب سے بڑی وجہ اس کا بھائی نہ ہونا ہے اور دوسری وجہ لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اجنبیوں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ صنفی امتیاز برتنے والی بھی عورتیں اور لڑکیاں ہی ہیں جن میں تین اس کی سگی بہنیں، سگی ماں اور تائی ہیں۔اس کا باپ یا تایا اس سارے معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ہمارے معاشرے میں مرد کی بالادستی کو تقویت دینے میں مرد سے زیادہ خود عورت کا ہاتھ زیادہ ہے۔یہ کہانی اس کی عمدہ مثال ہے۔عالیہ کو جذبات جب بار بار مجروع ہوتے ہیں تو وہ گھر سے باہر ایک مرد میں پناہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔باسط کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو پاتا۔ہوا در حقیقت یہ ہے کہ ناروا سلوک کی وجہ سے وہ ذہنی طور ہر پختہ ہو ہی نہیں پاتی۔وہ اپنے مرد میں شوہر سے زیادہ ایک باپ کو تلاش کرتی ہے۔بچپن کی تمام محرومیوں کا ازالا وہ ایک شخص کے ذریعے کرنا چاہتی ہے۔مرد کے لیے ایسی عورت کو سمجھنا اور اس سے نبھاہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔"وہ اس کی بچوں جیسی باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے وہ اسے ہماری طرح سنجیدہ اور پروقار دیکھنا چاہتے تھے اور جب وہ ایسا کہتے تو ہمیں از حد حیرت ہوتی۔عالی تو کبھی بچپن میں بچہ نہ رہی تھی۔لیکن باسط کی یہ شکایت بڑھ رہی تھی۔وہ عالی سے بچوں جیسی محبت کے طلبگار نہ تھے"۔(۳)ایک ایسی لڑکی جس کا اپنے گھر میں ماں باپ اور بہنوں سمیت کوئی پرسان حال نہ وہ اپنے شوہر میں ہر رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔وہ جب چھوٹی تھی تو ہر کوئی اس سے بیگانہ تھا۔اسی بچپنے کے ساتھ بڑی ہوتی ہے لیکن اسے شوہر نہیں سمجھ پاتا۔وہ بچپن میں جس نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھی یہ رویہ اسے مزید تقویت دیتا ہے۔وہ جسمانی طور پر تو جوان ہوئی لیکن ذہنی طور پر بچی ہی

تھی۔ نفسیاتی الجھنوں کی یوں توں کئی صورتیں ہوتی ہیں۔"ایک کی تشریح یہ ہے کہ چند خارجی یا داخلی واقعات یا تجربات کے دباؤسے آدمی نفسیاتی طور سے اپنے بچپن میں الجھ کر رہ جاتا ہے، جسمانی طور سے تو ترقی کرتا ہے لیکن جذباتی طور سے بچہ ہی رہتا ہے اور تیس یا چالیس سال کی عمر میں اس قسم کی جذباتی تسکین مانگتا ہے جو تین چار سال کے بچے طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص یا تو ہر طرح ناکامیاب رہتا ہے یا زندگی کی خارجی کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود اندرونی طور سے بے چین رہتا ہے۔ کیونکہ جو طفلانہ مسرت وہ ڈھونڈ رہا ہے وہ کہیں دستیاب نہیں۔"(۴)

ایسے عالم میں نارمل انسان اس گرہ کو کھول ہی نہیں پاتا جس میں اس کا ساتھی الجھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس کے رویے کو اس کی عمر سے ماپتا ہے سو شوہر اس کی تنہائی اور محرومی کو سمجھ ہی نہیں پاتا تو ازالا کیسے کرتا سو وہ اسے چھوڑ کے چلا جاتا ہے اور گھر والوں کے طعنے تشنے سننے کو وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں صدیوں سے یہ رواج ہے کہ شوہر کا گھر ہی عورت کا اصل گھر ہے۔ اس کے سگے بہن بھائی مشکل وقت میں اسے قبولنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بیاہ کے موقع پر اسے رو رو کے یوں وداع کیا جاتا ہے جیسے وہ ان کے لیے اسی روز مر گئی ہو۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کہانی میں اس وقوعہ کے بعد اسے تھپڑ مار کر بدنامی کا طعنہ دینے والی اس کی ماں نہیں بلکہ اس کی تائی اماں ہے جس نے اسے پالا ہے۔

ہمارے معاشرے ایک اور بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم بچے کے جذبات و احساسات کی قدر اس لیے نہیں کرتے کہ وہ بچہ ہے حالانکہ اس کے اندر غصہ، نفرت، محبت اور حسد وغیرہ کے جذبات وہی ہوتے ہیں جو اس سے عمر میں بڑوں میں ہوتے ہیں۔ عمر کے اگلے مراحل میں یہ تمام جذبات بچپن کی عمر کی توسیع ہی ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بچہ اظہار پر قادر نہیں ہوتا اور اگر لڑکپن کے زمانے میں اگر وہ اظہار کر بھی دے تو یا تو اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے یا مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر ایک اور المیہ یہ ہے کہ ہم بچوں سے وہ باتیں بھی چھپا جاتے ہیں جو نا صرف انہیں بتانا ضروری ہوتی ہیں بلکہ انہیں پر سا بھی دینا چاہیے۔"تلاش "کٹو نامی بچے کی کہانی ہے جو گھر کے بڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی ماں کئی روز سے بیمار ہے۔ اسے ہسپتال لے جایا جاتا ہے لیکن اصل صورت حال سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ گھر میں اس کی بڑی بہن عیشی ہے جس کا اس کے ساتھ کوئی مثالی سلوک نہیں ہے۔ اس کی ماں کی موت کے وقت بھی اسے سچائی سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ بڑی اماں یہی کہتی ہے کہ وہ ہسپتال میں ہے ایک روز جب وہ روتے ہوئے ضد کر کے کہتا ہے کہ میں بھی جاوں گا تو وہ اسے ان الفاظ میں تسلی دیتی ہے "ہئے ہئے پاگل ہے تو۔ میں تو ہسپتال نہیں جا رہی۔ مجھے تو پاس ہی میلاد شریف میں جانا ہے۔ بس بس چپ ہو جا میرا اچھا بیٹا۔"(۵) دیہاتی کلچر سے تعلق

رکھنے والی زندگی میں بچے کو اذیت سے بچانے کے لیے اور اذیت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ جس بات کا پتہ اسے اپنے گھر کے مکینوں سے لگنا چاہیے تھا اس کی خبر جب اسے باہر سے ہوتی ہے تو وہ ایک ناقابل برداشت اذیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ جو اپنے بڑوں پر اعتبار کر کے گھر کے اندر یا باہر کبھی اپنی ماں کی تلاش میں نہیں نکلتا گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اسے بازار میں جاتی ہوئی ہر عورت اپنی ماں دکھائی دیتی ہے۔ عیشی اور بڑی اماں کی اب اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اس بے کراں کائنات میں اکیلا ہے۔ ایسے ہی "کون کسی کا" کا مرکزی کردار کوثر جس کے ماں باپ مر جاتے ہیں۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ وہ گھر کے کام کاج کرنے پر معمور ہے۔ یہ کہانی گویا "تلاش" کی توسیع ہے۔ ماں پہلے کی مر چکی ہے نانی اسے اپنے ہاں لے آتی ہے۔ گھر میں ماموں کی ڈانٹ ڈپٹ کھاتا ہے۔ عین اس روز جب اس کے باپ کا انتقال ہوتا ہے اس کی ایک دور پار کی رشتہ دار منجو کچھ وقت کے لیے وہاں آتی ہے۔ وہ بچپن میں اس کی دوست رہی ہے۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے اس گھٹن زدہ ماحول میں وہ اسے سمجھ لے گی اور اس کے ساتھ وہی رشتہ قائم کرے گی۔ وقتی طور پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس کے باپ جنازہ اٹھتا ہے تو وہ یہ کہہ کر اسے روک لیتی ہے "نہ ویر تو نہ جا قبرستان بڑی دور ہے، تو بچہ ہے، اس دھوپ کو برداشت نہیں کر پائے گا۔"(۶) بچے نے زندگی میں کسی کے منہ سے ایسا جملہ کبھی سنا ہی نہیں۔ وہ اسی لمحے میں پگھل جاتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے اس کی زندگی کا خالی پن ختم ہو گیا ہو۔ وہ باپ کے غم کو بھول کر کچھ وقت کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ نہیں جان پاتا کہ یہ وہ وقتی ہمدردی تھی جو ہر یتیم بچے کے ساتھ چند گھڑیوں کے لیے سب کو ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر وہ بھول بھال جاتی ہے کہ اس نے اس بچے کو ہمدردی کے دو بول کہے تھے۔ اب اسے اس کے جذبات و احساسات کی کوئی پرواہ نہیں ہے وہ بھی باقی افراد کی طرح اسے مکمل نظر انداز کر دیتی ہے۔ یوں کہانی کے اختتام پر "اس کے قدم ڈگمگائے اور وہ لڑکھڑا کر ابا کی خالی چارپائی پر گر پڑا"(۷) گویا وہ اب ایک زندہ لاش ہے۔ وہ باقیوں کے کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ ہمارے معاشرے میں کتنے ہی ایسے بچے ہیں جن سے ان کی سطح پر جا کر مکالمہ نہیں کیا جاتا۔ ابلاغ کے فقدان کی وجہ سے ان کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ عفرا بخاری کی بیشتر کہانیوں میں بچوں کے کردار اور ان کے ساتھ ان کے بڑوں کے ناروا کی سلوک کی داستانیں ملتی ہیں۔ یہ تمام بچے وہ ہیں جو چاری دیواری میں قید ہیں اور نظر اندازی کی مشقت کا ہمہ وقت انہیں سامنا ہے۔ "دل کے ویرانے" میں تو ماں کے سامنے اس بیٹی اکلاپے کا شکار ہے جبکہ "فاصلے" ایک ایسے بچے کی کہانی ہے۔ للو کے ماں باپ میں علیحدگی ہو جاتی ہے اور اسے اس کا باپ شہر سے گاوں میں بھیج دیتا ہے جہاں اس کی دادی اور چچا اس کے لیے اذیت کا سبب بنتے ہیں۔ بچہ سمجھتا ہے کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے لیکن بڑوں کا المیہ یہ ہے کہ انہیں اس بات کا ادراک ہی نہیں کہ وہ کوئی زیادتی کر رہے ہیں۔ لمحہ موجود کا

طلسم یہ ہے کہ گزارنے والا خیال ہوتا ہے کہ یہ یہی جامد ہو جائے گا مستقبل آنے میں ابھی کافی تاخیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مستقبل کے آمد سے بے نیاز اپنی من مانی کرتا ہے۔ دادی اور چچا کا سلوک بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دادی جب کھردرے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ مروڑتی ۔۔"تو اسے بے اختیار اپنی ماں کا ملائم چہرہ نظر آجاتا۔ اس کا سانس آنسوؤں کی گھٹن سے رکنے لگتا۔ اس کا جی چاہتا وہ کسی نہ کسی طرح شہر بھاگ جائے۔ شہر کی فضا میں اسے اپنی ماں پیار گھلا ہوا محسوس ہوتا۔ اور گاؤں تو دادی کے سوکھے ہاتھوں کی طرح تکلیف دہ تھا۔ یہاں اس سے ایک بھی تو محبت کرنے والا نہ تھا۔ وہ یہاں کتنا تنہا اور اکیلا تھا۔"(۸) کتنی دردناکی ہے اس پیراگراف میں۔ دادی جو عام طور پر محبت کی علامت ہوتی ہے۔ اس کے لیے اپنا سگا پوتا ہی ناقابل قبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پوتے سے زیادہ اپنے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ اور اس کا بیٹا اس کے خیال میں سچا ہے اس کی بہو اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ حالانکہ جس بات سے وہ بے خبر ہے وہ یہ ہے کہ بیٹا یہاں کا روایتی شوہر ہے جس کے نزدیک بیوی اس کی غلام ہوتی ہے۔ وہ جیسا چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے۔ سو دادی بچے کو اس چڑیل عورت کا سپوت سمجھتی ہے اور اس سے بدلا لیتی ہے۔ کہانی میں لڑکے کے لیے راحت کا واحد سبب موتی نامی کتا ہے۔ دادی اور چچا سے گھر میں اور باہر اپنے ہم عمر لڑکوں سے مار کھاتا ہے۔ ایسے میں اس کی زندگی میں موتی آتا ہے جو اس سے ویسے ہی محبت کرتا ہے جیسے سوگندھی کا کتا اور کوچوان کا گھوڑا لیکن یہاں المیہ یہ ہے کہ للو ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول رہنے کی وجہ سے موتی کو بھول جاتا ہے۔ اور یوں جوابا موتی اسے فراموش کر دیتا ہے اور ایک بار پھر وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ بچے کی تنہائی کا ادراک اس کہانی میں کسی کو نہیں ہے۔ نہ ہی اس کے ماں باپ اور نہ ہی دادی چچا کو، باپ اسے گاؤں بھیج دیتا ہے ماں اسے چھوڑ کے چلی جاتی ہے اور کتا بے زبان جانور سے اس کے ساتھ اسے نبھا کرنا نہیں آتا۔ سو وہ اپنوں کے درمیان بیگانوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ عفرا بخاری کی کہانیوں میں ایک چھوٹا بچہ ہمیں لازمی نظر آتا ہے جس کی حیثیت اپنوں کے نزدیک سبزہ بیگانہ کی سی ہے۔ عام طور پر کہانیوں میں بڑوں کو چھوٹوں کے جذبات و احساسات کا ادراک نہیں ہوتا۔ بچے ایسے عالم میں ہی نوجوانی کی سلطنت میں قدم رکھتے ہیں۔ یا کہانی ایسے موڑ پہ ختم ہوتی ہے کہ قاری کو مستقبل کے امکانات بھی نظر آرہے ہوتے ہیں۔ انسان ایک ایسا جانور ہے جو اپنی فطرت اور عادات بدلنے پر قادر ہے وہ کبھی تولا ہے تو کبھی ماشہ اس کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ آج کسی سے محبت کر رہا ہے تو کل کسی وجہ سے اس شخص سے نفرت میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ "کچے دھاگے" اک انو نامی بچے کی کتھا ہے جس کی ماں مر چکی ہے اور اس کا باپ کچھ عرصہ بعد دوسری شادی کر لیتا ہے۔ وہ بالی نامی لڑکی کو یہ کہہ کر خرید لاتا ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ نہیں ہے۔ گھر میں آکے اسے پتا چلتا ہے کہ وہ نا صرف شادی شدہ تھا بلکہ اس کا اک بیٹا

بھی ہے۔اس بچے میں اسے اس کا بھائی نظر آتا ہے اور یوں وہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ تنہائی دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتی ہے ۔اس کہانی میں بھی دادی ہے لیکن اسے پوتے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب بالی حاملہ ہوتی ہے تو اس کی ایک پڑوسن اسے کہتی ہے کہ "تم انو کی طرف زیادہ نہ دیکھا کرو۔" کیوں" وہ حیران سی ہو گئی۔ تمہارا ہی فائدہ ہے۔ سہیلی نے کہا۔ جیسی صورت دیکھو گی ویسا ہی بچہ پیدا ہو گا۔" (۹) یہ جملہ اس کے دماغ میں ایک گرہ باندھ دیتا ہے۔ وہ انو سے دور ہونا شروع ہو جاتی ہے ۔بات بات پہ اسے دھتکارتی ہے۔اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتی ۔بظاہر وہ اس سے دکھاوے کے لیے نفرت کرتی لیکن یہ دکھاوا کب حقیقت میں بدل گیا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ وہ اسے منا منا کر تھک گیا لیکن وہ نہیں مانی۔ سردیوں میں اسے بخار ہوا، یوں وہ چپ چاپ مر جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد جب وہ واپس گھر آتی ہے تو وہ پہلے جیسی بالی ہے وہ آتے ہی انو کا پوچھتی ہے تو پتا چلتا ہے۔ یہ خبر اس سے اس لیے چھپائی جاتی ہے کہ حمل کے دنوں میں کوئی پیچیدگی نہ ہو۔ بالی اب روتی ہے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ محبت نفرت میں تو کبھی نفرت محبت میں بدل جاتی ہے۔ علی عباس حسینی کی کہانی "اندھیرا اجالا" بھی اسی سے ملتی جلتی ہے جس میں ایک سوتیلی ماں اپنے سوکن کے بچے سے یہی سلوک کرتی ہے۔

عفرا بخاری کی کہانیوں کی دنیا کا تعلق دیہات سے ہے۔ ہمارے ہاں دیہاتی ماحول میں بچوں کے ساتھ مکالمہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ ان کے معاملات زندگی کو عام طور پر در خور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اندرونی تنہائی کا شکار رہتے ہیں اور اسی عالم میں پروان چڑھتے ہیں۔ اور خاص طور پر وہ بچے جن کے ماں باپ مر جاتے ہیں یا جن کے درمیان طلاق ہو جاتی ہے یا سوتیلے ماں باپ کے سائے میں پروان چڑھنے والے بچے ذہنی طور پر عجیب طرح کے دباو کا شکار رہتے ہیں۔ ان کا بچپن خوف کے عالم میں ہی گزرتا ہے۔ محبت کے بول کبھی کبھار ہی انہیں سننے کو ملتے ہیں۔ یہ کہانیاں اس منظر نامے کی بہترین عکاس ہیں۔ ہمارے ہاں خاندانی نظام کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ لڑکپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھتے بچوں کو تربیت کا کوئی نظام نہیں ہے۔ کزنز کب بہن بھائیوں کی حدود سے نکلتے ہیں، کب بہن بھائی کہنے والوں کا اچانک پتا چلتا ہے کہ وہ تو میاں بیوی بننے والے ہیں تو نفسیاتی سطح پر ان میں جو توڑ پھوڑ ہوتی ہے ساری عمر وہ اسے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناول "اک چادر میلی سی" اس موضوع پر لکھا گیا اردو کا بہترین ناول ہے۔ "بند کلیاں" میں جوان ہوتا ہوا مسعود عطی آپا کے لیے کب بچے سے مرد بن جاتا ہے اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ سابقہ رشتے کے مطابق اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اسے دھتکار دیتی ہے۔ ایسے عالم میں اسے سمجھ ہی نہیں آتی کہ آخر اس کی آپا کو ہوا کیا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت سے نہ ہی کسی

کو کوئی سروکار ہے اور نہ ہی کوئی اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سو وہ ناسمجھ میں آنے والی اذیت میں مبتلا ہو کر بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکل جاتا ہے۔ یہ کہانیاں بالکل سادہ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ تمام واقعات اور کرداریوں لگتا ہے جیسے ہم انہیں جانتے ہیں۔ گویا گھر گھر کی کہانی ہو۔ "معمول کے واقعات ہیں ۔انہی واقعات کے تارو پود میں کرداروں کے نقش ابھرتے ہیں۔ ان میں کچھ کردار سیدھے سادے ہیں(سپاٹ نہیں، ٹائپ بھی نہیں) تاہم ان کی ظاہری سادگی کی تہہ میں ایک جہان معنی آباد ہے جو واقعات کے پردے میں آہستہ آہستہ اوپر کی سطح پر پہنچ کر اپنا آپ ظاہر کرتا ہے۔ واقعہ خارج میں تشکیل پاتا ہے۔ اس کی واقعاتی تہوں میں علامتی(Symbolic)اشارے بھی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔"(۱۰) بچے ان کہانیوں میں فطرت کی مسخ شدہ صورت کی علامت بن کے ہمارے سامنے آتے ہیں جبکہ عورتیں سی جی ژونگ کی زبان میں چڑیلوں کا روپ دھارے نظر آتی ہیں ۔ جنھیں بچوں کی نفسیات اور ان کے اندرونی مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس طرز کے افسانوں میں مردوں کا متحرک کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔

اوپر ہم نے جن کہانیوں کا ذکر کیا ان میں بچپن اور لڑکپن کے کرداروں کی تنہائی اور اس بنا پر ان کے المناک انجام سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی کہانیاں وہ ہیں جن میں اولاد والدین یا بڑوں کو غیر شعوری طور پر نظر انداز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے ان کی کہانی "چھینٹ کا لحاف" دیکھی جاسکتی ہے جس میں ایک ماں جس کے شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے۔ ماں اپنی بیٹی کا استحصال اسے جہیز میں سرخ اطلس کی رضائی نہ دے کر کرتی ہے اور شوہر مہر کے ڈھائی ہزار بھی لے اڑتا ہے۔ اب کی امید اپنے بیٹے منیر سے ہے جو باپ سے جھگڑ کر گھر سے ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔ پھر ایک روز اچانک اس کا خط دبئی سے آتا ہے ساتھ وہ بہت سا سامان بھی بھیجتا ہے۔ گاہے گاہے قیمتی رضائیاں اور کمبل بھیجتا ہے۔ اس کی ماں اسے خط لکھتے لکھتے رہ جاتی ہے تو ناسمجھ بیٹا اسے چھینٹ کے لحاف سے اس کی قربت کا طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "ماں تم بھی عجیب ہو، تم پرانی چیزوں سے اور پرانی عادتوں کو نہیں چھوڑ سکتیں۔"(۱۱) مائیں کبھی بھی بیٹوں سے فرمائش نہیں کرتیں بیٹوں نے خود اس ان کی ضروریات زندگی کو سمجھنا ہوتا ہے ان کا خیال کرنا ہوتا ہے۔ یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے بالکل بچوں کے کرداروں کی طرح ان کہانیوں کے بڑے بھی اسی بے توجہی کا شکار ہیں۔ "گھر کا مالک" میں باپ بیٹے کے درمیان تفاوت اتنی گہری ہے کہ کہانی کا انجام بھی المناک ہوتا ہے۔ بیٹے کا رویہ باپ کے ساتھ نہایت غصیلہ اور نامناسب ہے۔ وہ باپ کو اپنی زندگی سے بالکل بے خبر رکھتا

ہے مکالمے کی کوئی صورت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان خلیج بہت گہری ہو جاتی ہے۔ باپ کے سوال جواب سے تنگ آکر وہ یہاں تک کہہ دیتا ہے "ابا جی کو یہ نو عمروں والی چھچھوری حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ انہیں بزرگوں کی طرح خاموش اور دنیاداری سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیے۔"(۱۲) یہ تناو بچوں کے بڑوں کے درمیان خفیف صورت میں ہے جبکہ اولاد اور بزرگو ں کے درمیان تلخ اور ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کے پاس کوئی یادداشت نہیں ہوتی جبکہ اس کے مقابلے میں بڑون نے اولاد کے ساتھ ایک زمانہ بسر کیا ہوتا ہے۔ انہیں رہ رہ کر ماضی یاد آتا ہے۔ ایک ماں سرخ اطلس کی نہ ملنے والی رضائی کو ترستی مر جاتی ہے جبکہ "گھر کے مالک" کا باپ گھر میں موجود آخری نشانی پمپ کی جگہ نل لگتا ہوا دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے اس کے پاس اب کوئی بھی خوشگوار یاد باقی نہیں رہی۔ زندوں میں ماضی کی یاد اس کا بیٹا ہے جس کے نزدیک وہ ایک چھچھورا انسان ہے۔

زندہ انسانی تعلق خونی رشتوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہاں کہنے کو سب ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں لیکن بچوں، بڑوں، میاں، بیوی، ماں / باپ اور اولاد کے درمیان ابلاغ کا فقدان ایک ایسے خلا کو جنم دیتا ہے جو کبھی بھی پر نہیں ہوتا۔ ہر کردار اپنی اپنی ذات کے دائرے میں اسیر رہتا ہے اور مسلسل گھٹن کا شکار بن کے رہ جاتا ہے۔ عفرا بخاری کے ہاں گھریلو زندگی کے انمٹ نقوش ہیں۔ ان افسانوں کی دنیا گھر کی دنیا ہے۔ چند ایک کہانیاں ہی ایسی ہوں گی جہاں چار دیواری سے باہر اجنبی لوگوں کے اپسی تعلق اور اتار چڑھاو پر لکھا گیا ہو وگرنہ ان کی کل دنیا متوسط اور دیہاتی پس منظر کے کردار ہیں۔ بقول سہیل احمد خان "عفرا بخاری کی کہانیوں کی دنیا جانی بوجھی ہے۔ متوسط طبقے کے گھرانوں میں زندگی کے اتار چڑھاو کے کچھ رنگ ہیں، کچھ نقوش ہیں۔ کہانیوں میں گھروں کے اندر کی تصویریں باہر کی تصویروں سے زیادہ ہیں۔"(۱۳) یہ تصویریں مکالمے کے فقدان کی وجہ سے دھندلائی رہتی ہیں۔ ان کہانیوں میں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ہمارے معاشرے کی گھریلو زندگی کی تمام تفصیلات اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ یہ کہانیاں ہر پڑھنے والے کو کسی نہ کسی سطح پر خود پر بیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اسے بچپن سے لڑکپن اور جوانی سے بڑھاپے تک کے سارے رنگ ان میں نظر آتے ہیں لیکن یہ رنگ پھیکے ہیں۔ مرجھائے ہوئے پھول ہیں جو باس سے محروم۔ ایک ایسے باغ کی طرح جس کی زمانوں سے دیکھ بھال نہ کی گئی ہو۔ ہر کوئی اپنی دنیا میں مگن ہے۔ دکھ درد، خوشی غمی کا باہمی اظہار ناپید ہے۔ ان کے افسانے "دیوانے فرزانے" کی طرح۔ یہ دو

سوکنوں کی کہانی ہے۔ اجمل میاں کی پہلی بیوی زینب سے ایک بیٹی ہے جس کا نام رضیہ ہے۔ وہ جب ایک بیوہ زبین سے شادی کرتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ اپنے تین بچے بھی لے آتے ہیں۔ یوں ان کی باقی کہانیوں کی طرح رضیہ کا نفسیاتی بگاڑ شروع ہوتا ہے۔ سوکنوں کی آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ دوسری بیوی کے بچے تین بہن بھائی ہونے کی وجہ سے کسی مسئلے کا شکار نہیں ہیں۔ اجمل میاں کو کسی معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی بیٹی کے قریب نہیں تھے سو اب بھی نہیں ہیں۔ اس ساری صورت حال میں سب سے زیادہ نظر انداز ہونے والا کردار رضیہ ہے۔

> "ابھی وہ اتنی باشعور بھی نہیں تھی کہ اس گتھی کو سلجھا لیتی۔۔اسے کہاں اور کس طرف جانا تھا اور کس کی چاہت اور محبت کے سائے میں جینا تھا۔۔ماں کا حالات اور بیماری نے سخت بیزار اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ باپ، زبین اور اس کے بچوں کی خوفناک شخصیتوں کی اندھیری پستیوں میں گھر چکا تھا۔ سیدھی سادی رضیہ اپنی بڑھتی عمر کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی بجائے حالات کی پیدا کردہ الجھنوں اور تشنگیوں کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ پختگی کے ساتھ ساتھ سوچ میں جو ایک قدرتی ٹھہراو اور توازن ہونا چاہیے تھا، قائم نہ رہا۔ غیر شعوری طور پر وہ دوسروں کی ہمدردی اور محبت حاصل کرنے کی کوشش میں اس سے عجیب و غریب حرکات سرزد ہونے لگیں۔ زندگی بکھر گئی اور اسے سمیٹنے والا کوئی نہ تھا۔"(۱۴)

یہ محض ایک اقتباس نہیں ہے بلکہ عفرا بخاری کی اس قبیل کی کہانیوں کا جوہر ہے۔ نفسیاتی توجیہہ ہے۔"دل کے ویرانے" کی عالیہ کی طرح وہ بھی تمام محرومیوں کا ازالا اپنے شوہر انور میاں میں تلاش کرتی ہے۔ یہاں بھی وہ محبت حاصل کرنے کے لیے ایک بیوی سے زیادہ ایک بگڑے ہوئے بچے کا کردار ادا کرتی ہے یوں انجام طلاق پر ہوتا ہے۔ اس کا دکھ اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ ایک دوسرے کو کبھی برداشت نہ کرنے والی سوکنوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ لیکن اب وقت گزر چکا ہے۔ ماضی میں جا کر اسے بدلنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مستقبل اندھیروں کی آماجگاہ کے سوا کچھ نہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھیں اور اپنے ارد گرد دیکھیں کیا ہمارے ہاں ہر دوسرے گھر میں یہی مسائل نہیں ہیں۔ متوسط طبقے کے مسائل صرف معاش سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ اس طبقے کا سب سے بڑا مسئلہ اظہار کے فقدان کا ہے۔ اس فقدان کی وجہ سے انسان بچپن سے لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپے تک مختلف قسم کی باطنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) شیما مجید، مرتبہ، مقالات اجمل، (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۰)، ۴۴۱۔

(۲) عامر فراز کا ایک غیر مطبوعہ مضمون بعنوان "اس کی دنیا" یکم اکتوبر ۲۰۲۳ سے اقتباس، ا۔

(۳) عفرا بخاری، فاصلے، (لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۴)، ۱۹۔

(۴) شیما مجید، مرتبہ، مقالات محمد حسن عسکری، (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ا: ۱۱۴

(۵) عفرا بخاری، فاصلے، ۲۸ (۶) ایضاً، ۶۰۔ (۷) ایضاً، ۶۲

(۸) ایضاً، ۶۹۔ (۹) ایضاً، ۱۰۸۔

(۱۰) ریاض احمد، "پیش لفظ" مشمولہ آنکھ اور اندھیرا"، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۱۴۔

(۱۱) عفرا بخاری، آنکھ اور اندھیرا، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۳۴۔

(۱۲) ایضاً، ۸۲۔

(۱۳) سہیل احمد خان، عفرا بخاری کی کہانیاں، مشمولہ: نجات، (لاہور: عفرا پبلی کیشنز۔۱۹۹۸ء)، ۱۳۔

(۱۴) عفرا بخاری، ریت میں پاوں، (فیصل آباد: ہم خیال پبلشرز، ۲۰۰۳ء)، ۱۸۔

BIBLIOGRAPHY

- Afra Bukhari, *Fāsley*, (Lahore: Meri Library,1964).
- SheemaMajeed, (Edi) *Maqālāt-e Mūhammad Hasan Askrī*, (Lahore: Ilam-o Irfan Publishers, 2001).
- Afra Bukhari, *Rait Men Pāon*, (Faisal Abad: Hum Khyal Publishers,2003).
- Riaz Ahmed, Pesh Lafz, (Incl.) *Ānkh Aur Andhera*, (Lahore: Sanjh Publications, 2009).
- Sheema Majeed, (Edi.) *Maqālāt-e Ajmal*, (Lahore: Ilm o Irfan Publishers,2000).
- Sohail Ahmed Khan, Afra Bukhari ki Kahanian, (Incl.) *Nijāt*, (Lahore: Afra Publications,1998).

❖❖❖